ڈاکٹر احمد علی رجائی - استاد دانش گاہ مشہد (ایران)

تلخیص و ترجمہ : ڈاکٹر محمد ریاض

اقبال کا ایک شعر

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور

خود گرے، خود شکنے، خود نگرے، پیدا شد

اس مقالے کا موضوع اقبال کے مندرجہ بالا شعر کے چند ایسے نکات سے بحث کرنا ہے، جس کی طرف کسی دوسرے نے توجہ نہیں کی۔

میرے خیال میں اقبال ایک نو دریافت برّ اعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دلآویز اور قابلِ غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں۔ اُن کے فکر و نظر میں بے حد عمق تھا اور جب وہ لوگوں کی ظاہری آشنائی اور باطنی بے تعلقی کا گلہ کرتے ہیں تو اپنے اسی عمقِ فکر کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں:

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک　　　همه گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس ندانست این مسافر　　　چه گفت و با که گفت و از کجا بود

اقبال کے فارسی کلام میں الفاظ، تراکیب اور سبک کے اعتبار سے کوئی مشکل اور ابہام نظر نہیں آتا۔ میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہوں گا کہ اقبال کا ایک کمال ان کی سادہ گوئی ہے اور بڑی دلآویزی کے ساتھ وہ فلسفہ کے دقیق مسائل بیان کر جاتے ہیں۔ سادگی کا ایک اثر یہ ہے کہ بسا اوقات قاری ان کے نکات پر غور کیے بغیر گزر جاتا ہے۔ اقبال کی یہ سادگی ان کے مرشدِ معنوی مولانا جلال الدین رومی اور ایک حد تک خواجہ حافظ شیرازی کے سبک کے مشابہ ہے۔ رومی اور لسان الغیب حافظ نے قرآن مجید کی آیات اور احادیثِ نبوی ؐ کے استناد سے تصوّف و عرفان کے بلند پایہ مسائل بیان فرمائے اور اقبال نے ان موضوعات کے علاوہ فلسفیانہ اور سیاسی افکار کو بھی اسی سادگی سے منظوم کر ڈالا۔ وہ شاعری کی قوت سے ناقۂ بے مہار کو قطار کی طرف کھینچ رہے تھے۔ ان کی باتیں ایسی تھیں جنھیں برملا نہیں کہا جا سکتا تھا اس لیے ہم نفسانِ خام کو سرگرمِ عمل رکھنے اور دیرے دیرے انھیں اپنے مقاصد سے آگاہ کرنے کی خاطر انھوں نے کنایہ کی زبان اختیار کی ہے۔

سوز و گداز حالتی است بادہ ز من طلب مکن — پیش تو چون بیان کنم مستیِ این مقام را
نغمہ کجا و من کجا؟ سازِ سخن بہانہ ایست — سوی قطار می کشم ناقۂ بی زمام را
وقتِ صریح گفتن است من بکنایہ گفتہ ام — خود تو بگو کجا برم؟ ہمنفسانِ خام را

ایک دوسرے مقام پر اقبال نے بڑی خاکساری اور فروتنی سے فرمایا کہ فلسفی شاعر ہیں اور قدر ناشناسوں کی طرف ظرافت کے پیرایہ میں اس طرح اشارہ کر گئے کہ متاعِ شاعری کسی قدردان کے حسنِ معرفت کا معیار ہوتی ہے:

بیار بادہ کہ گردون بکامِ ما گردید — مثالِ غنچہ نواہا ز شاخسار دمید
نوا ز حوصلۂ دوستان بلند تر است — غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نشنید
عیارِ معرفتِ مشتری است جنسِ سخن — خوشم از آنکہ متاعِ مرا کسی نخرید
ز شعرِ دلکشِ اقبال می توان دریافت — کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

فلسفہ طرازی کے باوجود اقبال اعلیٰ غزل گو ہیں اور جس غزل کے ایک شعر پر ہم کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ غالباً ان کی بہترین منظومات میں سے ہے اور وہ عالمی ادبیات کے شاہکاروں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اس کا موضوع "میلادِ آدم" ہے

اس غزل میں اقبال کے فکر و فن کی مہارت دیکھنے کی خاطر ضروری ہے کہ اس دنیا کے بارے میں غور کریں جس میں آدم کا وجود نہ تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب آسمان عشق کے بارِ امانت کو نہ اٹھا سکا اور بقولِ حافظ ظلوم و جہول انسان کے نام ہی اس بار کا قرعۂ فال نکلا:

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

جہانِ بے آدم میں شبستانِ ازل کے پردہ نشین براجمان ہیں۔ ملائکہ جو شہوت و غضب سے عاری ہیں عالمِ ملکوت کے عبادت خانوں میں مصروفِ بندگی ہیں اور پوری کائنات میں سکوت اور اطاعت کا دور دورہ ہے موجودات میں جلوۂ ایزدی کے انجذاب کی صلاحیت نہیں۔ خدا کی محب موجودات تو ہیں مگر محبوب کوئی نہیں کہ یحبہم و یحبونہ کی شان جلوہ گر ہو سکے۔ حسن تھا، مگر صاحب نظروں کا محتاج کہ وہ اسے منکشف کر سکیں۔ حسن کا ادراک عشق کا خاصہ ہے اور بقول حافظ فرشتے عشق و محبت سے محروم ہیں:

فرشتہ عشق نہ داند کہ چیست ای ساقی — بخواہ جام و گلابی بخاکِ آدم ریز

ایسی حالت میں ساقیٔ ازل حیاتِ سرمدی کا جامِ محبت ہاتھ میں لیتا ہے اور آدم کے خمیر کو اس طرح تیار کرتا ہے کہ عشق و محبت کا عنصر اس میں نمایاں ہو سکے۔ آخر کار خاکِ مجبور کے خمیر سے آدم پیدا ہوتا ہے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے گنبدِ افلاک میں ولولہ پیدا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی آرزوئیں پوری کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ چونکہ وہ تسخیرِ فطرت پر قادر ہے اس لئے اسے دیکھ کر ساری کائنات پر لرزہ طاری ہے۔ تخلیقِ آدم اور کائنات کی لرزہ براندامی کو ہماری ان نارسا سطور سے بدرجہا بہتر انداز میں اقبال نے پانچ اشعار میں بیان فرمایا ہے:

نعرہ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگری، خودشکنی، خودنگری پیدا شد
خبری رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — حذر ای پردگیان، پردہ دری پیدا شد
آرزو بی خبر از خویش بآغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگری پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر — تا ازین گنبدِ دیرینہ دری پیدا شد

ہماری بحث مذکورہ غزل کے دوسرے شعر کے بارے میں ہے یعنی:

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگری، خودشکنی، خودنگری پیدا شد

مصرعِ ثانی کی تراکیب کے کیا معانی ہیں؟ خودشکن، خودگر اور خودنگر کس قسم کا آدمی ہے؟ یہ باتیں واضح ہوں تو شعر کی تشریح ہو جاتی ہے۔

خودشکنی

اقبال کے فلسفے اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے دو طرح کی خودی اور اسی طرح دو قسم کی "خودشکنی" کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ پہلا خود نفس کے مترادف ہے اسی نفس کے جو "امارہ بالسوء" ہے اور مولانائے روم کے الفاظ میں "بشرِ خونخوار"[1] یہ خود احتیاجاتِ زندگی کا مظہر ہے اور اگر انسان ان ہی احتیاجات کی برآری کے درپے ہو تو وہ اپنے اعلیٰ مقاصد سے دور جا پڑتا ہے۔ اقبال اس خودشکنی کی تعلیم دیتے ہیں کہ انسان ان جبلی تقاضوں کو پورا تو کرے۔ مگر اسے ادنیٰ تصور کرے اور اپنی تمام تر توجہات کو فکر و نظر کی بالیدگی پر مرکوز کر دے۔ حیوانی تقاضے پیشِ نظر رہیں تو علم و ہنر اور فضل و شرف بے ارزش بن جاتے ہیں۔ اور اسی لئے اقبال ان تقاضوں کے مظہر (خود، نفس) کو توڑنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

انسانی زندگی سفلی احتیاجات کو رام کرنے سے ہموار و استوار ہوتی ہے ورنہ یہی حوائج زندگی کی زمامِ کار

---

[1] مثنوی شریف تصحیح نکلسن جلد ۳ صفحہ ۴۲۹

بن جاتی ہیں۔ جو انسان خواہشات و احتیاجات کا مطیع و منقاد ہو وہ اس آلۂ کار کی مانند ہے جس میں شخصیت، ارادہ اور آزادی کا نقدان ہو۔ ایسا انسان ابدی سعادت اور دائمی مسرت سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ "خوش آیند" کے درپے ہے اور "خوش آیند" حقیقی نیکی کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ضمناً یہ بات غور طلب ہے کہ باہوش افراد میں سے بعض "خوش آیند" چیزوں کے درپے ہوتے ہیں اور بعض "حقیقی نیکی" کے۔ ان دونوں گروہوں کی راہیں جدا ہیں۔ اس لیے کہ کتنے کام "خوش آیند" اور دل پذیر ہیں مگر وہ "حقیقی نیکی" سے غیر منسوب ہیں مثلاً ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنا اور نازونعمت سے پر زندگی بسر کرنا "خوش آیند" ہے۔ مگر یہ کام حقیقی نیکی سے اتنا دور ہے کہ اس کی توضیح تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ دھوکا دینا اور طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کو دبانا بھی ذہانت و استیلا کے اعتبار سے "خوش آیند" ہیں۔ مگر غرورِ نفس میں مبتلا کرنے والے یہ اوصاف شیطنتِ محض ہیں۔ ان کے مقابلے میں کسبِ کمالِ معنوی اوصاف جیسے کہ تعلیم و تربیت اور ہنرمندی کا حصول اور دین و وطن کی خاطر سرفروشی طبیعت کے لیے خواہ بارِ گراں بھی ہوں، ابدی خوبیاں ہیں۔ اور اقبال کا مقصد یہی ہے کہ ان مقاصد اعلیٰ کی خاطر "خود شکنی" کی جائے۔ خلاصہ یہ کہ اقبال "خوش آیند و دلپذیر" کے مقابلے میں "خوبیِ مطلق" کی خاطر خودشکنی کی تلقین فرماتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تعلیم صوفیہ کی "خود شکنی" سے مختلف ہے اور ہم اس اختلاف کی طرف اشارہ کریں گے۔

"خود شکنی" یہ ہے کہ تقاضائے زیست انسان پر اس طرح اثر انداز نہ ہو جس طرح حیوانوں پہ ہوتا ہے۔ اگر انسان تقاضائے زیست کے غلام بن جائیں تو وہ حیوانات کے اس گلہ کے مشابہ بن جاتے ہیں جس میں ہر حیوان طاقت و رعب سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کسی حیوان کو یارائے مقاومت نہ ہو تو وہ یا دوسروں کا لقمہ غذا بن جاتا یا خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ حیوانی زور کے بل بوتے پہ نیکی و خوبی قائم نہیں رہ سکتی، مگر یہ زور بھی زورِ سیلاب ثابت ہوتا ہے۔ عظمتِ یونان کے انحطاط اور سلطنتِ روم کے سقوط پر بھی غور فرمائیں۔ مورخ تھوسائیڈڈیز نے پانچویں صدی ق۔م میں لکھا ہے کہ ایتھنز کے حاکم السیبیاڈیز نے سربراہ ملک بننے کی خاطر سسلی سے جنگ شروع کی تھی اور نتیجہ اس کے اندازے کے برعکس تھا۔ اقبال کی تعبیر کی رو سے یوں کہنا چاہیے کہ چوں کہ السیبیاڈیز اور اس کے ہم صفیر "خود شکنی" نہ کر سکے اس لیے ان کی ہوس عظمتِ یونان کے انحلال پر منتج ہوئی۔

اقبال نے بانگِ درا میں کہا ہے اور بعض فارسی شعرا نے بھی دھیمے سروں سے اس "خود شکنی" کا ذکر کیا ہے۔

پانچویں صدی ہجری کا فلسفہ طراز شاعر ناصر خسرو (م ۴۸۱ ھ) "خودی" سے باہر آنے اور دست خود سے رہا ہونے کی اس طرح تلقین کرتا ہے :

گر بتوانی بزدوستی جہان رست — بنگر کہ ز خویشتن توان رفتن

وای بر آن کو ز خویشتن نہ بر آید — سوزد نارش بہر دو عالم خرمن

شیخ عطار (م ۶۱۸ھ) مثنوی "منطق الطیر" میں "چار چوب طبع" (طبیعت کے چوکھٹے) کے عرفانی مفہوم کی مدد سے خود شکنی کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ مور سے خطاب کرتے ہیں اور اُسے سات سروں والے سانپ اور "دیوار طبیعت" (نفس) سے برحذر رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ (مور کے بارے میں یاد رہے کہ روایات کے مطابق یہ شیطان کا آلۂ کار بنا۔ اور بہشت بریں سے اغوائے آدم کے سلسلے میں ممد ابلیس ہوا)۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں :

چار چوب طبع بشکن مردوار — در درون غار وحدت کن قرار

خہ خہ ای طاؤس باغ ہشت در — سوختی از زخم مار ہفت سر

صحبت این مار در خونت فگند — وز بہشت عدن بیرونت فگند

بر گرفتست سدرہ و طوبیٰ ز راہ — کردت از سد طبیعت، دل سیاہ

تا نگردانی ہلاک این مار را — کی شوی شائستہ این اسرار را

خواجہ حافظ نے ایک غزل میں تقاضا ہائے حیات کی خاطر "سرائے طبیعت" کی دلآویز اصطلاح استعمال کی ہے۔ مگر حافظ اور اقبال کے مفاہیم کا اختلاف خواجہ کے درج ذیل اشعار سے واضح ہو جائے گا :

بعزم مرحلۂ عشق پیش نہ قدمی — کہ سودہا کنی ار این سفر توانی کرد

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیرون — کجا بکوی طریقت گذر توانی کرد

دلی تو تالب معشوق وجام می خواہی — طمع مدار کہ کار دگر توانی کرد

دلا ز نور ہدایت گر آگہی یابی — چو شمع خندہ زنان ترک سر توانی کرد

گر این نصیحت شاہانہ بشنوی حافظ — بشاہراہ حقیقت گذر توانی کرد

یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال کی "خود شکنی" صوفیہ کی "خود شکنی وافنائے نفس" سے متغائر ہے۔ صوفیہ کی اکثریت نے نفی خودی کی تعلیم دی ہے۔ کئی حضرات خواہشات نفس کی کلیتہً نابودی کے حامی رہے ہیں۔ اقبال

نفیِ خواہشات کے حامی ہیں نہ ترکِ دنیا کے۔ وہ حریتِ فکر و نظر اور تہذیبِ نفس کے داعی ہیں۔ واضح تر الفاظ میں وہ ابقائے نفس و خودی کے حامی اور استقلالِ مزاج کے مبلغ ہیں۔ نفیِ خودی کی تعلیم کو وہ اقوامِ مغلوب کا ایسا تملق نما حربہ قرار دیتے ہیں جس کی مدد سے وہ اقوامِ غالب کے قویٰ کو مضمحل بناتے اور ان کے ایجابی اوصاف کو سلبی بنا دیتے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال نے ایک دلآویز داستان لکھی ہے[۵]

کسی مقام پر بھیڑوں کی ایک عمدہ چراگاہ تھی مگر شیروں نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اور وہ ہر وقت ان کمزوروں کے لیے دندانِ جوع تیز کیے رہتے تھے۔ بھیڑیں ان خونخواروں سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں۔ ایک دن ایک عاقل بھیڑ نے کہا، بھیڑوں کو شیر نہیں بنا سکتے، ہاں شیروں کو بھیڑ بنایا جا سکتا ہے۔ دیکھتے جائیے۔ بھیڑ، شیروں کے لیے مبلغ بنی اور اپنے دعوۂ الہام سے انہیں ہمہ تن گوش بنایا۔ بولی: زور آزمائی اور خونخواری، شقاوت کی دلیل ہے اور اس سے تم اس جنت سے محروم رہوگے جو غریبوں اور کمزوروں کا ٹھکانا ہے۔ چند روزہ سکرات اور لذتِ کام و دہن کی خاطر اپنی عقبیٰ کو خراب نہ کرو۔ صید و شکار سے محترز اور تارک اللحم، محبوبِ خدا ہیں۔ آخر تم گھاس پھوس کھا کر بھی تو جی سکتے ہو!

شیر بھیڑ کے اس وعظ سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کی باتوں پر عمل پیرا ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے میں شیر مگر عملاً وہ بھیڑ بن گئے۔ اس قسم کی خودشکنی کے اقبال سخت مخالف ہیں۔ جس سے انسان فضائل کی بجائے، رذائل کا تابع ہو جائے۔

'خودی' یا 'نفس' کا دوسرا مفہوم جس کے اقبال مدت العمر مؤید رہے، اثباتِ ذات، عرفانِ نفس اور تکمیلِ قویٰ کی وہ تعلیم ہے جسے دنیا ان کے 'فلسفۂ خودی' کے نام سے جانتی ہے۔ خودی یا ایغو وہ ابدی حقیقت ہے کہ اس کے مرتبۂ کمال کو موت بھی نہیں مٹا سکتی اور اقبال نے اس کی یوں تعریف فرمائی ہے:

خودی تعویذِ حفظِ کائنات است — نخستین پرتوِ ذاتش حیات است
خودی را پیکرِ خاکی حجاب است — طلوعِ او مثالِ آفتاب است
درونِ سینۂ ما خاورِ او — فروغِ خاکِ ما از جوہرِ او
از آن مرگی کہ می آید چہ باک است — خودی چون پختہ شد از مرگ پاک است

---

[۵] ماخوذ از اسرارِ خودی۔

ز مرگِ دیگری لرزد دلِ من — دلِ من، جانِ من، آب و گلِ من
ز کارِ عشق و مستی بر فتادن — شرارِ خود بخاشاکی ندادن
بدستِ خود کفن بر خود بریدن — بچشمِ خویش مرگِ خویش دیدن
ترا این مرگ هر دم در کمین است — بترس از وی که مرگِ ما همین است

ان اشعار میں بظاہر صوفیانہ "خودشکنی" کی تعلیم کی جھلک نظر آتی ہے مگر بباطن ایسا نہیں ہے۔ اقبال کی خودشکنی ایسی ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مالا مال کر دیتی ہے۔ وہ انفرادی زندگی تک محدود نہیں رہ سکتی۔ وہ تقاضائے زیست اور اس کے مادراسے ہم آہنگ ہے۔ وہ 'خودگری' اور 'خودنگری' سے جدا نہیں کی جا سکتی۔

خودگری

خودگری کے موضوع پر اقبال نے ۱۹۳۲ء میں ایک اسلامی کانفرس کے صدارتی خطبے میں یوں روشنی ڈالی تھی۔

"مسلمان سارہا سال سے زندگی کی گہرائیوں کے بارے میں غور و تعمق نہیں کرتے اور اسی لیے انہیں موجودہ انحطاط سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اپنے نفوس (قلب و خاطر کی کیفیات) کو بدل نہ دے[1]۔ آپ اپنی خودی کو پختہ کریں۔ اپنی مٹی سے ایسا آدم بنائیں جو اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرے۔ مگر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر زندہ ہو۔ ایسا آدم ہی خودگر ہے جو شعلۂ حیات سے اپنے ماحول کو تسخیر کرتا اور دوسروں کے معدہ پائے روح کو حرارتِ باطنی سے مالا مال کر دیتا ہے[2]"

خودگری سعیِ پیہم اور قوتِ ارادی کا استحکام ہے۔ یہ قول نہیں فعل ہے۔ یہ ایسا داعیہ ہے جو زندگی کے جملہ حوادث میں آدمی کو پا بہ رجا رکھتا ہے۔ خودگر شخص عارضی سود جوئی کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ وہ پائدار اور مثبت اقدار پر متوجہ رہتا ہے۔ خودگری خلاقی اور مغالیت ہے۔ ایسی خلاقی اور مغالیت جو سطحی حیوانیت سے بہت بالاتر ہو۔ البتہ یہ کام لفظی کم اور عملی زیادہ ہے۔ یہ ان ہی لوگوں کو سزاوار ہے جو جسم سے زیادہ روح پر توجہ رکھیں۔ ہر ملک میں ایسے افراد معدودے چند ملتے ہیں اور جب باصلاحیت لوگ شاکی ہوتے ہیں کہ آدمی نہیں ملتے، تو ان کا مقصد 'خودگر' افراد سے ہی ہوتا ہے۔ ایسے افراد جن کا لائحہ عمل بدل نہیں سکتا۔ نہ یہ کہ

۱؎ قرآن مجید ۱۳: ۱۲ نیز ملاحظہ ہو دیباچہ پیام مشرق (مترجم)

۲؎ اقبال شناسی [illegible] تہران صفحہ ۱۰۳

پیشوں اور لائحہ ہائے عمل کے سرگرداں لوگ جو مدد جوئی اور دنیوی ترقی و بقا کو اپنی معراج جانتے ہیں۔ مثلاً زراعت، تجارت اور تدریس میں فوائد کا مقابلہ کریں گے اور پھر کسی ایک کے انتخاب میں لگیں گے۔ عمر بھر ان پیشوں کے سلسلے میں سرگرداں رہیں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے، بددل زارع ہو یا تاجر یا مدرس ہو، کوئی مفید کام نہیں کر پائے گا۔ معاشرے کی خاطر خواہ خدمت کرنے کی خاطر 'خودگری' کی بے حد اہمیت ہے! اقبال 'خودگری' سے محروم لوگوں سے بہتری کی امید نہیں رکھتے۔ حُبِّ ذات اور شخصی مفادات پر مرمٹنے والے خودغرض لوگ کر بھی کیا سکتے ہیں! بہر طور 'خودگر' گروہ ہے جو اپنے اندر انقلاب پیدا کرے۔ محکم قوتِ ارادی کا مالک ہو۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں،

بینی جہان را خود را نہ بینی — تاچند نادان غافل نشینی
نورِ قدیمی شب را برافروز — دستِ کلیمی در آستینی
بیرون قدم نہ از دورِ آفاق — تو پیش از اینی، تو بیش از اینی
از مرگ ترسی ای زندہ جاوید! — مرگ است صیدی تو در کمینی
جانی کہ بخشند دیگر نہ گیرند — آدم بمیرد از بی یقینی
صورت گری را از من بیاموز — شاید کہ خود را باز آفرینی

خودنگری

'خودنگری' تکمیل انسانیت کا نقطۂ معروج ہے جب انسان 'خودشکنی' سے فراغت حاصل کرے اور 'خودگری' میں لگ جائے۔ غرورِ نفس سے آزاد ہو کر مراقبت اور خدمت کو شعار بنالے:

خوش آنکہ رخت خرد را بہ شعلۂ می سوخت — مثالِ لالہ متاعی ز آتشی اندوخت

تو 'خودنگری' عرفانِ کامل کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ 'خودنگری' انسان کے مقابلے میں کائنات کی قوتوں کو ہیچ سمجھنا ہے۔ یہ مطمحِ نظر کی بلندی اور پاکیزگی ہے۔ ایسا مطمحِ نظر جو افلاک کو مقہور و مغلوب بنائے اور عالمِ ملکوت کے سکان کا محسود ہے۔ اقبال نے مچھلی اور شاہین کے بچوں کے درمیان ایک مکالمے کے تمثیلی انداز میں نہایت اعلیٰ و ارفع فلسفیانہ مطالب بیان فرمائے ہیں۔ ماہی تقاضا ہائے زیست میں محصور اور محیطِ بحر میں محو ہے جبکہ شاہین وسعتِ افلاک میں پرفشاں ہے اور اپنی خودشکنی، خودگری اور خودنگری کی صفات کی بنا پر سفلی تقاضوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

ماہی بچۂ شوخ بہ شاہین بچہ گفت — این سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست

دلدائی نہنگانِ خروشندہ تراز میغ | در سینۂ او دیدہ و نادیدہ بلاہاست
با سیلِ گران سنگ و زمین گیر و سبک خیز | با گوہرِ تابندہ و با لولوئے لالاست
بیرون نتوان رفت ز سیلِ ہمہ گیرش | بالای سرِ ماست، تہ پاست، ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است | از گردشِ ایام نہ افزون شد و نہ کاست
ماہی بچہ را سوزِ سخن چہرہ برافروخت | شاہین بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ "شاہینم و کارم بہ زمین چیست | صحراست کہ دریاست تہ بال و پرِ ماست
بگذر ز سرِ آب و بہ پہنائی ہوا ساز | این نکتہ نہ بیند مگر آن دیدہ کہ بیناست"

بے خودی

اب دوسری 'خود شکنی' کا مختصر ذکر کر دیں۔ یہ اس 'خودی' کو توڑ دینا ہے جسے اتنی محنت سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ 'خود شکنی' مشروط ہے جسے 'بیخودی' کہتے ہیں۔ یہ فرد اور معاشرہ کا رابطہ ہے۔ اس معاشرتی مقصد (بے خودی) کی بے حد اہمیت ہے۔ انسان اپنی جملہ صلاحتیں معاشرہ اور قوم کی خاطر وقف کر دیتا ہے۔ اس طرح معاشرہ قوی ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ 'خودی' کو اس 'خود شکنی' کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وہ ایک 'جزو' ہے اور 'کل' میں شامل ہو کر معاشرہ کو قوی کرے گا۔ اور اس طرح اپنی وابستگی اور بقا کا سامان کرے گا[1]۔ اقبال 'خودی' کی تعلیم دینے کے باوجود 'خود شکنی' اور 'بے خودی' کے سخت مؤید ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اچھے رکن معاشرہ اور عمدہ شہری بنیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس ایک شعر میں ان کے نظامِ فلسفہ کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے[2]۔

---

[1] رموزِ بے خودی کی تمہید :

در جماعت خود شکن گردد خودی | تا ز گل برگی چمن گردد خودی

[2] اصل مقالہ مجلہ دانشکدہ ادبیات مشہد ایران شمارہ ۲، ۳ سال ۱۳۴۴ ش میں چھپا ہے۔ (مترجم)